غزل کا فن

اردو شاعری میں غزل کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ قصیدہ ہے، مرثیہ ہے، مثنوی ہے مگر جو قبولِ عام غزل کو حاصل ہوا وہ کسی اور صنف کو نصیب نہ ہو سکا۔ طرفہ تماشا یہ کہ اردو میں جب سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اسی وقت سے غزل کی مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ حالی کو اس میں سنڈاس کی بدبو محسوس ہوئی، کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن ٹھہرایا، عظمت اللہ خاں نے مشورہ دیا کہ غزل کی گردن بے تکلف اڑا دینی چاہیے۔ ایسی شدید مخالفت کے باوجود غزل کی مقبولیت میں ذرہ برابر کمی نہ آئی، اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور غزل نے اپنی توانائی کا ایسا ثبوت دیا کہ آج کوئی اس صنفِ سخن کے خلاف لب کشائی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ حد یہ کہ ہندی والوں نے غزل کو جوں کا توں اپنا لیا۔ آج کوی سمیلن میں جس چیز کی سب سے زیادہ مانگ ہے، وہ ہے غزل!

غزل کی مقبولیت کے اسباب

غزل بنیادی طور پر ایک داخلی صنفِ سخن ہے۔ مطلب یہ کہ غزل کا شاعر صرف وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر بیتی ہو۔ شاعر کے دل پر گزرنے والی کیفیات وہی ہوتی ہیں جو دوسروں پر بھی بیت چکی ہوتی ہیں۔ لہٰذا پڑھنے والے یا سننے والے کو غزل میں اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔ گویا "کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔" اس طرح غزل میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ جو کچھ شاعر کے دل پر گزرتی ہے اس کے لیے تنقید میں مختلف الفاظ موجود ہیں۔ احساسات، جذبات، واردات، قلبی واردات، تجربہ، شعری تجربہ یا جمالیاتی تجربہ۔ لیکن غزل کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ احساسات و جذبات کے علاوہ غزل میں فکر کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ نئی

غزل کا شاعر صرف وہی پیش نہیں کرتا جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے، بلکہ وہ بھی پیش کرتا ہے جو سوچتا ہے، جو دیکھتا ہے۔ لیکن بہتر آج بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ شاعر کا خیال یا اس کی فکر جذبہ و احساس بن کر غزل کے شعر میں ڈھل جائے، اسے محسوس فکر کہا جا سکتا ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کا خاص موضوع عشق رہا ہے۔ اور عشق وہ جذبہ ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں، یوں کہ عشق کے ہزار روپ ہیں — مرد کا عورت یا عورت کا مرد سے عشق، ماں باپ کا اولاد یا اولاد کا ماں باپ سے عشق۔ ملک و قوم پر جان نچھاور کرنے کا نام بھی عشق ہے۔ کسی عظیم مقصد کی والہانہ لگن بھی عشق ہے، مرشد سے مرید کی عقیدت بھی عشق ہے اور سب سے ارفع و اعلا عشق وہ ہے جو انسان کو محبوبِ حقیقی یعنی خدا سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا کوئی دل نہیں، عشق کا تیر جس کے پار نہ ہوا ہو۔ چنانچہ جذبۂ عشق کی تاثیر مسلّم ہے۔ اور غزل اپنی ابتدائی منزل میں اسی جذبے کے اظہار کے لیے وقف تھی۔ زمانے کے ورق اُلٹتے رہے۔ آخر وہ دن بھی آیا جب احساس ہوا کہ عشق بہت کچھ ہے مگر زندگی میں عشق کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ اس وقت تک عشق غزل کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کا حل یہ نکلا کہ غزل کے شاعر نے دنیا جہان کی باتیں کہیں مگر بالعموم حسن و عشق کے پیرائے میں۔ غالب نے غزل کے بارے میں ہی تو کہا ہے —

مطلب ہے ناز و غمزہ وَلے گفتگو میں کام   چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اردو غزل میں لفظ تو وہی استعمال ہوتے رہے — عاشق، معشوق، رقیب، ہجر، وصال لیکن معنی بدلتے رہے۔ اپنے عہد کے شاعر فیض کی مثال لے لیجیے۔ ان کی شاعری میں یہ علامتیں ضرور استعمال ہوئی ہیں مگر ان کے معنی مختلف ہیں مثلاً معشوق سے مراد ملک و قوم، عاشق سے مراد محبِ وطن اور رقیب سے مراد ملک و قوم کے دشمن۔

آج اردو غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ دنیا کا کوئی مضمون اور کوئی موضوع نہیں جسے غزل نے اپنے وجود میں سمو نہ لیا ہو لیکن حساب لگا کے دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ غزل میں آج بھی عشق کا پلّہ ہی بھاری ہے۔

بتانے پر مجبور ہے۔ عام طور پر غزل کا شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنا تجربہ یا اپنی واردات ایک شعر میں سمونی پڑتی ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اسے پیش کرنے کے لیے شاعر کو بس دو مصرعوں کا مختصر سا پیمانہ میسر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے کہ وہ جس تجربے سے دوچار ہوا ہے وہ ان دو مصرعوں میں سما جائے۔ اس کے لیے پہلی تدبیر تو یہ اختیار کی جاتی ہے کہ بات اشاروں میں کہی جاتی ہے۔ قاری جو غزل کی روایت سے آگاہی رکھتا ہے وہ ان اشاروں کا مطلب خود نکال لیتا ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے ـــــ

تم سمجھے جناب آپ آئے کہیں سے   پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

شاعر یہ نہیں بتاتا کہ ہم اور آپ سے کیا مراد ہے لیکن ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم عاشق کے لیے استعمال ہوا ہے اور آپ محبوب کے لیے۔ محبوب کہاں سے آ رہا ہے یہ بھی نہیں بتایا جاتا لیکن یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ وہ رقیب کے گھر سے آ رہا ہے۔ دوسری تدبیر جس سے کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کچھ بیان کرتا ہے اور کچھ قاری کے تخیل پر چھوڑ دیتا ہے۔ قاری اپنے تخیل سے کام لے کر خلا کو خود پُر کر لیتا ہے۔ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کے لیے ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مذکور یعنی جس بات کا ذکر کر دیا گیا اور جسے بیان کیے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے اسے محذوف کہتے ہیں مطلب یہ کہ حذف کر دیا گیا یا کیے کر چھوڑ دیا گیا۔ خیال کے لیے غالب کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ـــــ

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس میں مذکور کم ہے اور محذوف زیادہ۔ دیکھیے ـــ قفس میں ایک پرندہ بطور قیدی ہے۔ صیاد ایک اور پرندہ پکڑ کے لاتا ہے اور اسی قفس میں قید کر دیتا ہے۔ اس پر پہلا قیدی پرندہ اس نئے اسیر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو چمن سے ابھی آیا ہے۔ بتا چمن کیسا ہے اور میرے آشیاں کا کیا حال ہے۔ وہ حال بتانے لگتا ہے۔ لیکن کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو جاتا ہے۔ یہاں تک شعر میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ شعر میں مذکور نہیں۔ اسے مجبوراً حذف کر دیا گیا۔ اس کی خاموشی کو پہلا پرندہ جو کچھ مطلب لیتا ہے شعر میں صرف وہی بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے نئے رفیق! مجھ پر جو گزری اسے بتانے میں تامل مت کر (محذوف: یعنی کل جو بجلی گری اور میرا آشیاں جل کر راکھ ہو گیا) جو آشیاں جل کر خاک ہو گیا اب اس سے میرا کیا واسطہ۔ یہاں بھی یہ محذوف ہے کہ میرا مستقل گھر تو اب یہی قفس ہے۔ باقی

زندگی یہیں گزرنی ہے۔ اس شعر میں ان کہی بات، کہی گئی بات سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ اشارے میں کہی جانے والی بات میں زیادہ دلکشی ہوتی ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے جس کے معنی ہیں کنایے میں صراحت سے زیادہ حسن ہوتا ہے۔

جب بات وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہیں کہی جاتی تو اس میں ایک طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے ابہام کہا جاتا ہے اگر نثر مبہم ہو جائے تو یہ اس کا عیب ہے۔ نثر میں جو کچھ کہا جائے وہ صاف سمجھ میں آنا چاہیے اور ضروری ہے کہ سننے والے کے ذہن میں بالکل وہی معنی آئیں جو کہنے والے کے ذہن میں ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نثر میں وضاحت، صراحت اور قطعیت ہونی چاہیے لیکن شعر میں ابہام سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ ابہام کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شعر کے ایک سے زیادہ معنی نکل سکتے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے ـــــ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر کیوں یاد آیا؟ اس لیے کہ وہاں بھی دشت کی سی ویرانی تھی۔ دوسرا مطلب ـــ دشت پیمائی سے یہ سبق ملا کہ نہ عشق کرتے نہ گھر چھوڑ کے یہاں آنا پڑتا۔ تیسرا مطلب ان دونوں سے بالکل الگ ہے۔ دشت کو دیکھ کے خیال آیا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں، اصل ویرانی تو میرے گھر میں تھی۔ مطلب یہ کہ محبوب کے نہ آنے سے گھر ویران نظر آتا تھا۔ شعر کی یہ تہ داری ابہام کی رہینِ منت ہے۔

اچھے شعر کی ایک اہم خصوصیت تصویر کشی بھی ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ تصویر جتنی دھندلی ہو گی اتنی ہی دلکش ہو گی۔ ایک شعر میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے جزئیات کو قلم انداز کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے غزل کے شعر میں تصویر لامحالہ دھندلی ہو جاتی ہے اور بقولِ شبلی یہی تصویر کا حسن ہے۔

غزل کی دلکشی کا سب سے بڑا سبب اس کی غنائیت ہے۔ شعر میں ترنم یا موسیقی نہ ہو تو وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ غزل میں یہ خوبی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی دوسری صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ پوری غزل کسی ایک بحر میں ہوتی ہے یعنی اس کے ہر مصرعے کا وزن یکساں ہوتا ہے جس سے ایک خاص دھن پیدا ہوتی ہے۔ ردیف و قافیہ بھی غزل کی موسیقی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سید عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ موسیقی میں ضرب جو کام کرتی ہے غزل میں قافیہ وہی کام کرتا ہے۔ ضرب کو آپ طبلے کی تھاپ سمجھ لیجیے۔ ردیف کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں

[illegible] کا علم رکھتی ہے۔ یہ اس کی موسیقیت، ترنم، موزونیت کو بڑھاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ غزل کا شاعر لفظوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں موسیقیت و ترنم کا خیال رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل بہت اچھی طرح گائی جاسکتی ہے۔ اسی لیے محفلوں اور شادیوں میں غزل بے حد مقبول ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ غزل کے شعر آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور مختلف موقعوں پر ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک شعر میں ایک تجربہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب بھی کوئی شخص اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوگا وہ آسانی سے اس شعر کو دہرا دے گا۔ کبھی کبھی تو صرف ایک مصرعے سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ کسی دوست نے بے وفائی کی تو ہمیں یہ مصرع یاد آئے گا ــ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کوئی شخص اپنے عمل پر شرمندہ ہوا مگر اس وقت جب ہمیں اس کے عمل سے نقصان پہنچ چکا تو ہم کہہ سکتے ہیں ــ

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ ہے غزل کا فن اور یہ ہیں وہ خصوصیات جنھوں نے غزل کو ایسا ہر دل عزیز بنا دیا کہ ہر دور میں وہ باقی تمام اصناف پر چھائی رہی اور شاید آئندہ بھی یہی صورت رہے گی۔ رشید احمد صدیقی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔

2

غزل کی ہیئت

غزل کے فن کو سمجھنے کے بعد غزل کی ہیئت یعنی اس کی ظاہری شکل کو سمجھنا بھی ضروری ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اردو کے قدیم

[illegible]

[illegible] محبوب کا سراپا ہے، عشق

کی مختلف کیفیتیں ہیں [illegible]

ولی کے بعد شاعری کا مرکز شمالی ہند میں استحکام حاصل کرتا ہے۔ دہلی اس کا صدر مقام ہے۔ اس مرکز کے پہلے بڑے شاعر میر ہیں۔ حسن و عشق ان کی غزل کا بھی سب سے اہم موضوع ہے لیکن ان کے دیوان میں تصوف کے مسائل بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں لیکن جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ زندگی سے متعلق اہم تجربات بھی غزل میں پیش کیے جانے لگے ہیں گو ان کی تعداد کم ہے۔ کلیات میر میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں——

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی　　ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

اس کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ کو منتقل ہوا۔ یہاں اردو شاعری کو زوال ہوا مگر دو قابلِ قدر اضافے بھی ہوئے۔ ایک تو یہ کہ امرد کے بجائے عورت کو اردو شاعری کی دنیا میں باریابی حاصل ہوئی دوسری بات یہ کہ یہاں ہجر کے بجائے وصال کے مواقع میسر تھے۔ اس لیے حزن و ملال کے بجائے خوشی اور سرمستی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔

لکھنوی شاعری کے اس دور کے بعد غالب کا عہد آتا ہے جس میں مومن نے تو غزل کے دائرے کو عشق و عاشقی تک ہی محدود رکھا لیکن غالب نے اس میں فکر کا عنصر داخل کیا۔ بجا طور پر کہا گیا کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔ غالب نے زندگی سے متعلق بے شمار مسائل کو اردو غزل میں داخل کیا۔ پھر اقبال نے یہ ثابت کر دیا کہ غزل میں صرف فکری عنصر ہی کی گنجائش نہیں بلکہ باضابطہ فلسفہ بھی اس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فلسفۂ خودی نظم کے علاوہ غزل میں بھی پیش کیا۔ فیض نے غزل میں سیاسی شاعری کی۔ اور جدید دور کے شاعروں نے تو ثابت کر دیا کہ غزل ہر مضمون اور ہر موضوع

[illegible]

غزل پر اعتراضات

[illegible]

اس اعتراض کے جواب [illegible] اعتراض کیا اس زمانے میں [illegible] اردو غزل کے موضوعات [illegible] انھیں اپنے شعروں میں جگہ دیتے تھے [illegible] اس لیے عشق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا [illegible] شکلیں ہیں، مثلاً خدا سے عشق، ماں باپ سے عشق، اولاد سے عشق، وطن سے عشق [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ [illegible] یعنی علامتیں تو وہی رہتی ہیں جو عشقیہ شاعری میں استعمال ہوتی [illegible] لفظ محبوب کے معنی کہیں خدا ہوتے ہیں کہیں معشوق مجازی کہیں وطن کہیں قوم [illegible]

یہ تو بالکل غلط کہا گیا کہ [illegible] معاملاتِ عشق کو پیش کرنے کا کوئی حق نہیں [illegible] ہوتی ہے کہ جو کچھ اس نے اصلیت میں دیکھا انھیں تخیل کی آنکھوں سے [illegible]

یہی نہیں وہ تخیل کی بدولت اس کے دل پر بیت جاتی ہے۔ سورداس پیدائشی نابینا تھے۔ جو تخیل کی کرشمہ سامانیوں سے ناواقف ہے وہ کیسے یقین کر سکے گا کہ ان کی شاعری میں جو تصویریں بکھری ہوئی ہیں وہ انھوں نے دیکھ کر نہیں محض سن کر بنائی ہیں۔ شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں اٹلی کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں جنھیں دیکھ کر لوگوں کو کہنا پڑا کہ ہمارا شاعر ضرور اٹلی گیا ہوگا۔ شیکسپیر نے طبقۂ نسواں کی تصویر کشی بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ وہ زندگی میں کبھی عورت بھی رہا ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شاعر نے جو کچھ بچشم خود دیکھا نہیں اور جو کچھ اس کے دل پر بیتا نہیں، تخیل کے طفیل وہ اس طرح اس کے پیش نظر ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر اس طرح بیت جاتا ہے کہ وہ ہمیں شاعر کا اصلی اور واقعی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ غرض یہ آخری اعتراض تو بالکل بے وزن ہے۔

اردو غزل پر حالی کا دوسرا اعتراض تکرار مضامین کا ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ چند مضمون ہیں جنھیں غزل میں لفظوں کے معمولی الٹ پھیر کے ساتھ بار بار پیش کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک دیوان کی مثال دی ہے جس میں چاک گریباں کا مضمون ڈیڑھ سو بار ادا ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہم نے بھی چودہ برس شاعری کی پھر جب آنکھ سے پٹی کھلی تو معلوم ہوا کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گردش کرتے رہے۔ اس اعتراض کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں ایک تو یہ کہ کسی مضمون کو کئی دل نشیں انداز میں ادا کرنا عیب نہیں ہنر ہے اور اس سے شاعر کے کمال فن کا پتا چلتا ہے۔ میر انیس نے اپنی اسی خصوصیت پر فخر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ——

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

حضرت علی نے بجا ارشاد فرمایا کہ باتیں نہ دہرائی جایا کرتیں تو کبھی کی ختم ہو چکی ہوتیں۔

غزل کی جو خصوصیت سب سے زیادہ اعتراض کا نشانہ بنی وہ ہے اس کی ریزہ کاری۔ ریزہ کاری سے مراد یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے یعنی ہر شعر میں ایک مکمل بات کہہ دی جاتی ہے۔ ایک غزل کے مختلف شعروں میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے ایک شعر میں وصال کا ذکر ہو تو دوسرے میں ہجر کا اور تیسرے میں ان دونوں سے مختلف۔ غزل کی یہ وہ خصوصیت ہے جس پر سب سے زیادہ نکتہ چینی کی گئی۔

ہمارے نزدیک یہ غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ہر شعر میں ایک مکمل تجربہ پیش کر دیا جاتا ہے

دو مصرعوں میں کوئی پورا تجربہ اسی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ اشارے کنایے سے کام لیا جائے۔ جب کوئی بات اشارے میں کہی جاتی ہے تو اس میں عموماً ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور ابہام سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہر شعر میں ایک الگ منفرد تجربہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے جب کوئی اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے تو اس شعر کو وہ سہارا دیتا ہے۔ چنانچہ غزل کے بے شمار اشعار ہیں جو ضرب المثل بن گئے اور گفتگو کے دوران خوب استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ شعر دل کی بات ادا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں اور گفتگو کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

غزل پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ اس میں جو معشوق پیش کیا جاتا ہے وہ امرد یعنی لڑکا ہے۔ اور کبھی کبھی تو اس کی داڑھی مونچھ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر ——

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

داڑھی مونچھ کا ذکر تو واقعی نامناسب تھا اور رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ مگر تذکیر کا صیغہ باقی رہا مثلاً "وہ آ گئے تو لب بھی ہلایا نہ جا سکا۔" اس کا مقصد ایک تو رازداری ہے اور دوسری یہ کہ یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی شخص مرد ہے یا عورت تو مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر اپنے ملازم سے یہ کہتے ہیں کہ "دیکھو کون آیا ہے" یہ کبھی نہیں کہتے کہ کون آئی ہے۔ اسی طرح غزل میں زنانہ لباس کے ذکر کو بھی عیب بتایا گیا۔ اس کا رواج بھی ختم ہو گیا۔

غزل کے شاعر کو زیادہ پابندیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ غزل کا ہر مصرع یکساں وزن میں ہوتا ہے۔ قافیے کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ قافیے کی پابندی ہی کچھ کم نہیں۔ شاعر کو ہر شعر قافیے کی رعایت سے کہنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی غزل میں قافیے کے علاوہ ردیف کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ یا قافیہ و ردیف دونوں کا اہتمام ہو۔ آخری شعر جو مقطع کہلاتا ہے اس میں شاعر کو اپنا تخلص لانا ضروری ہوتا ہے۔ بے شک یہ پابندیاں غزل کو ایک مشکل فن بنا دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ پابندی بھی کچھ کم نہیں کہ غزل کا شاعر دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنے پر مجبور ہے۔ ان پابندیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ مشورہ دیا گیا کہ صنف غزل کا مٹا دینا اردو شاعری کے لیے مفید ہوگا۔ یہ مشورہ درست نہیں۔ اگر کوئی شاعر ان پابندیوں کے باوجود اچھی غزل کہنے کی قدرت رکھتا ہے تو اسے روکنے کا

کسی کام کی نہیں۔ غزل کہنے میں دو مصرعوں میں مطلب ادا کرنا ہے لیکن جس کے ذریعے وسعت خیال سے معنی اخذ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایک انگریزی نقاد نے درست کہا ہے کہ شاعری کو الگ ہونا چاہیے اور اس کی لذت سے سرشار رکھنا چاہیے۔ اس کو دیکھ کر جو محنت ہے اس سے بھی کیا کسی کو واقف پہلے وقت میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کے لیے چاول پہلے ہی کتنی ذہنی محنت ہوگی۔ کچھ نہیں۔ بس یہی معاملہ غزل کا ہے۔ جو شاعر غزل کی پابندیوں کو غیر معمولی جکڑ بندی سمجھتا ہو اس کے لیے مثنوی ہے، نظم ہے، پھر معریٰ اور آزاد نظم ہے اور اس سے آگے بڑھیے تو نثری نظم ہے۔ غزل جیسی لطیف اور دلکش صنف کو قتل کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ غزل کے شاعر کو الٹے چلنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ ردیف (اگر غزل مردف ہے تو) پہلے سے طے ہے۔ اس سے پہلے قافیہ ہے۔ پھر قافیے کی رعایت سے دوسرا مصرع پہلے مکمل ہوتا ہے پھر اس پر گرہ لگائی جاتی ہے یعنی پہلا مصرع کہا جاتا ہے۔ اس طرح غزل کہنے کی ترتیب الٹی ہوئی۔ بے شک یہ بات درست ہے لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسرا مصرع پہلے اور پہلا مصرع بعد کو کہتا ہے لیکن پڑھنے والے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہی غزل گو کا کمال ہے۔

دیکھا آپ نے صنف غزل پر کتنے سخت اعتراضات کیے گئے مگر ان کے کیسے مدلل جواب موجود ہیں۔ کہتے ہیں ڈان کوئکزوٹ اپنے نیزے سے پون چکیوں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ اُن چکیوں کا تو بال بیکا بھی نہ ہوتا تھا مگر اس کا نیزہ ضرور ٹوٹ جاتا تھا۔ ان اعتراضات سے غزل کا تو کچھ بھی نہ بگڑا اور یہ اعتراض ایسی دلیلوں کے ساتھ رد کیے گئے کہ معترضین کو لاچار خاموش ہونا پڑا۔ ✻ ✻

Scanned by TapScanner